کلمہ طیبہ کی حقیقت

از

محمد منظور نعمانی

کلمۂ طیبہ

جس میں اسلام کے کلمۂ دعوت (لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ) کے دونوں جزو (توحید الٰہی اور رسالت محمدی) کی تشریح پوری تحقیق کے ساتھ اور تاامکان موثر انداز میں کی گئی ہے اور اس کلمہ کی روح و حقیقت کو واضح کر کے بتلایا گیا ہے کہ اپنے ماننے والوں سے اس کلمہ کا مطالبہ کیا ہے۔

از

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ مدیر ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ

ملنے کا پتہ

کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

بار چہارم ۱۰۰۰ — مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ — قیمت ۶/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ طیبہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

جزو اوّل ________ توحید الٰہی

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

کوئی معبود نہیں (یعنی کوئی عبادت اور بندگی کے لائق نہیں) اللہ کے سوا

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ　　ساز مارا پردہ گرداں لا الٰہ

لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

حرفش از لب چوں بدل آید ہمی

زندگی را قوت افزاید ہمی

توحید دین کی بنیاد اور ایمان کی جان ہے اور اپنی اپنی امتوں کے لیے سب نبیوں کا پہلا پیغام ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ　　اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول

مِنْ رَسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ — مگر یہ وحی کرتے رہے اس کی طرف کہ
أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا — کوئی عبادت کے لائق نہیں میرے سوا
فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء ع۲) — پس میری ہی عبادت اور بندگی کرو۔

اور اس توحید کے ماننے نہ ماننے اور اس کے مطابق چلنے نہ چلنے ہی پر انسان کی سعادت و شقاوت اور نجات و ہلاکت کا مدار ہے، صحیح مسلم میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن صحابہ سے ارشاد فرمایا۔

ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ — دو چیزیں ہیں جو واجب کر دیتی ہیں

کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ مَا الْمُوْجِبَتَانِ حضرت کیا دو چیزیں ہیں واجب کر دینے والی؟

قَالَ مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ — ارشاد فرمایا جو شخص اللہ کے ساتھ
بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ — کسی چیز کو شریک کرتا ہوا (یعنی کسی
وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ — طرح کا شرک کرتا ہوا) مرا وہ دوزخ
بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ — میں جائے گا، اور جو ایسے حال میں
(مسلم) — مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا تھا (یعنی شرک سے پاک اور موحد تھا) تو وہ جنت میں جائے گا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:۔

إِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ — بیشک اللہ کا خاص حق اپنے بندوں پر

اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ
شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى
اللّٰهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبَ مَنْ
لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا
(بخاری و مسلم عن معاذ رض)

یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں
اور اس کے ساتھ کسی کو شریک
نہ کریں۔ اور بندوں کا حق اللہ
پر یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو عذاب
میں نہ ڈالے جو شرک نہ کرتے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ
لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
ثُمَّ مَاتَ عَلٰى
ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ
الْجَنَّةَ (بخاری و مسلم عن ابی ذر رض)

جو کوئی بندہ "لا الٰہ الا اللہ" کا
قول کرلے (یعنی توحید کو اپنا دین
مانلے اور اس پر قائم ہوجائے)
اور پھر اسی حال پر مرجائے تو یہ
نہیں ہوسکتا کہ وہ جنت میں نہ جائے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہ سے ارشاد فرمایا کہ جاؤ اور جو ایسا آدمی ملے کہ

يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ
فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ (مسلم)

وہ دل کے یقین کے ساتھ "لا الٰہ الا اللہ"
کی گواہی دیتا ہو اس کو میری طرف
سے جنت کی بشارت سنادو۔

اسی طرح حضرت عثمان رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ
اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

جو کوئی اس حال میں دنیا سے گیا
کہ وہ لا الٰہ الا اللہ پر یقین واعتقاد

وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ (مسلم) — یقیناً اُس پر جنت واجب ہو گئی۔

اور حضرت معاذ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ شَهَادَةُ — "لا الٰہ الا اللہ" کی شہادت جنت

اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (رواہ احمد) — کی کنجی ہے۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

مَا نَجَاةُ هٰذَا الْاَمْرِ؟
فَقَالَ مَنْ قَبِلَ مِنِّي
الْكَلِمَةَ الَّتِي عَرَضْتُهَا
عَلٰى عَمِّي فَرَدَّهَا فَهِيَ
لَهُ نَجَاةٌ (رواہ احمد)

اس دین میں نجات کا حاصل فقط کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا جس نے میرا لایا ہوا وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ (جو) میری دعوت پر قبول کر لیا جو میں نے اپنے چچا ابوطالب پر (اُن کے آخری وقت میں) پیش کیا تھا اور انھوں نے اُس کو نہ مانا۔ تو وہی کلمہ ماننے والے کے لیے اصل نقطۂ نجات ہے۔

لیکن ان حدیثوں کا مطلب یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ بس لا الٰہ الا اللہ کہنے اور توحید کا اقرار کر لینے ہی سے ہم نجات کے مستحق اور جنت کے ٹھیکہ دار ہو گئے، بلکہ ان احادیث کا مطلب صرف یہ ہے کہ نجات کی سب سے بڑی شرط یہ توحید ہے اور اس کے بغیر نجات قطعاً ناممکن ہے تو جس نے اس دعوتِ توحید کو قبول کر لیا اس نے نجات کی یہ بڑی شرط پوری کر دی اور شرک کی وجہ سے نجات اور جنت کا دروازہ جو اس کے لیے قطعی بند تھا وہ اب توحید کو اختیار کر لینے کی وجہ سے کھل گیا، رہے اس کے علاوہ اور شرائط، مثلاً ایمان بالرسول، اور

ایمان بالیوم الآخر اور دین کے اہم مطالبات مثلاً صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ کی ادائگی، تو ان کا معاملہ بجائے خود ہے اور قرآن و حدیث میں اپنے اپنے موقع پر ان شرائط کو بھی پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور دوسرے طور پر یوں بھی کہا جا سکتا ہو کہ "لا الٰہ الا اللہ" کو قبول کر لینا اور توحید کو اختیار کر لینا درحقیقت پورے دین کو قبول کر لینے، اور اختیار کر لینے کا ایک عنوان ہے اور اس لیے ان احادیث کا مطلب یہ ہو کہ جس نے "لا الٰہ الا اللہ" کو قبول کر لیا یعنی جس نے اس پورے دین کو اختیار کر لیا جس کی اصل و اساس اور جڑ بنیاد "لا الٰہ الا اللہ" ہو تو وہ ضرور جنت میں جائے گا۔

بہرحال مندرجہ بالا تمام حدیثوں میں (اور ان کے علاوہ بھی اور بہت سے نصوص میں) بڑی صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ نجات کا اصل دار و مدار توحید پر یعنی لا الٰہ الا اللہ کے پیغام کو قبول کر لینے اور اس کو اپنا اصول زندگی بنا لینے پر ہو۔

توحید کی حقیقت اور لا الٰہ الا اللہ کا مطلب

لیکن اس توحید کی حقیقت اور اس لا الٰہ الا اللہ کا مطلب سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جہاں تک خدا کی ذات اور اس کی صفت خلق و ایجاد اور تدبیرِ عالم (یعنی دنیا کے پیدا کرنے اور اس کارخانۂ عالم کو چلانے) کا تعلق ہے، تو عرب کے وہ مشرک بھی جن کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے توحید کا پیغام پیش کیا وہ بھی اس حیثیت سے خدا کو "وحدہٗ لاشریک" مانتے تھے، یعنی اپنا عقیدہ وہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ اللہ جو اس دنیا کا پیدا کرنے والا ہو وہ اپنی ذات میں بالکل اکیلا اور لا شریک ہو؛ اسی نے اس

بنا سکتی، تو پیدا کیا ہے اور وہی دنیا کے اس پورے کارخانہ کو چلا رہا ہے۔ قرآن مجید میں مشرکین عرب کا یہ اقرار اور اعتقاد جا بجا نقل کیا گیا ہے۔ (سورۂ یونس ع ۴، سورۂ مومنون ع ۵، سورۂ عنکبوت ع ۶)

مشرکین عرب کا شرک اور دعوت توحید کا ان سے مطالبہ

مگر اس کے باوجود چونکہ وہ عبادت[1] میں جو صرف اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ اپنے دیوتاؤں اور فرضی معبودوں کو بھی شریک کرتے تھے اور ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہوئے اپنی خاص حاجات

---

[1] عبادت سے مراد یہاں وہ خاص اعمال ہیں جو کسی ہستی کو الٰہ و معبود اور نفع و ضرر کا مالک سمجھ کر اس کے سامنے اپنی نیازمندی اور ذلت کے اظہار کے لیے اور اس کو راضی اور خوش کرنے کے لیے ہی کیے جاتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، حج، صدقہ، سجدہ، طواف، نذر و نیاز اور قربانی وغیرہ ـــــ اس قسم کا کوئی عمل اگر غیر اللہ کے لیے کیا جائے تو اس کا کرنے والا قرآن پاک کی رو سے قطعاً مشرک ہے اور دنیا کی اکثر مشرک قوموں میں یہی شرک رہا ہے اور شرک فی العبادت اسی کو کہتے ہیں ـــ ـــ ـــ اور انبیاء علیہم السلام کو زیادہ تر اسی شرک سے لڑنا پڑا ہے ـــ ۱۲

اور مشکلات میں اُن سے دعائیں کرتے اور مدد مانگتے تھے اس لیے مشرک قرار دیے گئے[۵] ۔ بہرحال عرب جاہلیت کی تاریخ اور قرآن شریف کی بھی صدہا آیات سے

---

[۵] معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم اسباب میں جو تاثیریں اور خاصیتیں جن چیزوں میں رکھ دی ہیں، مثلاً آگ میں گرمی، پانی میں ٹھنڈک اور پیاس بجھانے کی خاصیت، یا مثلاً تلوار میں کاٹنے کی صلاحیت تو ان چیزوں سے ان مقاصد میں کام لینا ہرگز توحید کے منافی نہیں ہے، بلکہ عین منشاء الٰہی ہے (ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ یعنی وہی اللہ ہے جس نے پیدا کیا تمھارے واسطے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے) اور علیٰ ہذا اپنے جن بندوں کو جو مجازی طاقتیں اور قابلیتیں اس عالم اسباب میں اللہ تعالیٰ نے عطا کر رکھی ہیں، مثلاً کسی زوردار کو اس قابل کر دیا کہ وہ مظلوم کی مدد کر سکے یا مثلاً بادشاہوں اور حاکموں کو سلطنت و حکومت کی وہ قوت عطا فرمادی کہ وہ ظالم سے مظلوم کا انتقام لے سکیں، یا مثلاً طبیبوں اور ڈاکٹروں کو اس کی صلاحیت بخشدی کہ وہ بیماروں کا علاج کر سکیں، یا مثلاً ہر ایک کو اس لائق بنا دیا کہ وہ دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کر سکے وغیرہ وغیرہ، تو سلسلۂ اسباب و مسببات کے ماتحت ان لوگوں سے ان اُمور میں مدد لینا جیسا کہ دنیا میں عام طور سے رائج ہے ہرگز شرک نہیں ہے، بلکہ مقام توکل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ بہرحال غیر اللہ سے وہی استعانت شرک ہے جو اللہ کے قائم کیے ہوئے اس سلسلۂ اسباب و مسببات سے بالاتر کسی ہستی کو نفع و ضرر کا مالک مختار اور فاعل بااختیار سمجھ کر کی جائے، جیسا کہ بت پرست اپنے بتوں اور دیوتاؤں سے اور بہت سے جاہل اور ناخدا شناس آدمی ارواح خبیثہ اور جنات اور شیاطین سے اور بہت سے نام کے مسلمان اصلی یا فرضی ولیوں شہیدوں سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور اپنے مقاصد

(باقی صفحہ پر)

معلوم ہوتا ہے کہ ان کا بڑا ابتلاء یہی دو طرح کا شرک تھا یعنی ایک شرک فی العبادت اور دوسرے شرک فی الاستعانت۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "لا الٰہ الا اللہ" کا جو پیغام ان کے سامنے پیش کیا اس کا اولین مطالبہ ان سے یہی تھا کہ جب اللہ کو تم اس کی ذات میں اور اس دنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں وحدہٗ لاشریک سمجھتے ہو تو عبادت و استعانت کا تعلق بھی صرف اسی سے رکھو اس کے سوا کسی کی پوجا نہ کرو، کسی کو اپنا حاجت روا نہ سمجھو اور اپنی حاجات و مشکلات میں اس کے سوا کسی کو نہ پکارو، یہی آپ کی دعوت توحید کا اولین مطالبہ تھا، اور اسی کو آپ اپنے دین کی بنیاد اور اصل و اساس کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ سورۂ یونس کے آخری رکوع میں فرمایا گیا

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ	اے پیغمبر ان لوگوں کے سامنے
كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ دِينِي	اعلان کر دو کہ اے لوگو! اگر تم میرے
فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ	دین کے متعلق کسی شک و شبہ میں ہو
مِنْ دُونِ اللهِ وَلٰكِنْ أَعْبُدُ	تو سنو میرا طریقہ یہ ہے کہ میں نہیں
اللهَ الَّذِي يَتَوَفّٰكُمْ	عبادت کرتا اُن کی جن کو تم پوجتے ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) کے لیے ان سے دعائیں کرتے ہیں اور اسی مشرکانہ اعتقاد کی بنا پر ان کی خوشنودی کے لیے نذر و نیاز وغیرہ عبادات کرتے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی مخلوق کے ساتھ جو کوئی ایسا برتاؤ کرے اور ایسے امور میں اس سے مدد کا طالب ہو وہ بے شک مشرک ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی بے نظیر کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" میں شرک و توحید کی بحث میں بڑی وضاحت سے "استعانت" کی ان دونوں قسموں کے فرق کو بیان کیا ہے۔ منہ

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ
وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا
وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ
فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا
مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ
فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا
هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ
بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ
لِفَضْلِهٖ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ

(یونس ع ۱۱)

لیکن میں صرف اس اللہ کی عبادت
کرتا ہوں جو تم کو اٹھا لیتا ہے اور
مجھے حکم ہے کہ ہو جاؤں میں ایمان
والوں میں سے اور نیز مجھے حکم ہو کہ
سیدھا کر لے رخ اپنا اس دین کے
لیے (یعنی توحید کے لیے) بالکل یکسو
ہو کر اور مت ہو شرک کرنے والوں
میں سے، اور مت پکار اللہ کے سوا
کسی ایسے کو جو نہ تجھے کوئی نفع دے
سکے اور نہ کچھ ضرر پہونچا سکے، اور
اگر تو نے یہ کیا تو پھر تو بھی ظالموں
میں ہو جائے گا، اور اگر اللہ
پہونچا دے تجھے کوئی تکلیف تو کوئی
نہیں ہے اس کو ہٹا سکنے والا اس
کے سوا، اور اگر وہ چاہے تجھے کسی
بھلائی سے نوازنا تو پھر کوئی نہیں
روکنے والا اس کے فضل کو، پہونچا
دے جسے چاہے اپنے بندوں میں سے،
اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

اسی طرح اور بھی بہت سی آیات میں توحید فی العبادت اور توحید فی الاستعانت کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

عبادت و استعانت کا باہمی لزوم

اور یہ عبادت و استعانت باہم کچھ ایسے لازم و ملزوم سی بھی ہیں، مشرک لوگ کسی دیوتا کی پوجا عموماً اسی غلط فہمی کی بنیاد پر کرتے ہیں کہ اپنی حماقت سے وہ ان کو نفع و نقصان اور بناؤ بگاڑ کا مالک و مختار اور حاجت روا و مشکل کشا سمجھنے لگتے ہیں۔ بہرحال نفع و ضرر کا عقیدہ ہی معبودان باطل کی پوجا کا سبب بنتا ہے۔[1] اسی لیے قرآن مجید میں تعلیم توحید کے سلسلے میں بار بار اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ مشرک جن فرضی معبودوں کی پوجا کرتے ہیں ان کے قبضہ و اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔

---

[1] یہی وہ بلیغ اور اہم نکتہ ہے جس پر حضرت فاروق اعظم نے اپنی خاص فاروقی شان کے ساتھ اس وقت تنبیہ فرمائی جب کہ حج کے موقع پر حجر اسود کو چومنے سے پہلے باواز بلند آپ نے اپنے اس ایمان و یقین کا اعلان فرمایا:۔

وَ اَیْمُ اللّٰہِ اِنَّكَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ	اور قسم خدا کی تو بس ایک بے جان پتھر ہے نہیں کوئی نفع پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان دے سکتا ہے۔
(بخاری)	

انہی لفظوں سے آپ نے یہ بھی بتلا دیا کہ حجر اسود کو ہمارے چومنے اور اس کی تعظیم کرنے میں اور بت پرستوں کے اپنے بتوں کے ساتھ طرز عمل میں کیا اصولی اور بنیادی فرق ہے۔۱۲

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ	(اے رسولؐ! ان مشرکوں سے) کہو!
زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ	کہ خدا کے سوا تم جن کو حاجت روا
اللّٰهِ لَا يَمْلِكُونَ	اور کارسا نہ سمجھے ہوئے ہو ان کو پکارو
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي	وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے آسمانوں
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ	میں اور نہ زمین میں اور نہ ان
وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا	دونوں میں ان کی کوئی شرکت ہے
مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ	اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا
مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ	مددگار ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ	کہو! تم پکار دیکھو اپنے اُن دیوتاؤں
زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ	کو جن کو خدا کے سوا تم اپنا کارساز
فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ	سمجھے ہوئے ہو، وہ نہ تو تم سے تکلیف
عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا	دُور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ
(بنی اسرائیل ع ۶)	تکلیف ٹال ہی سکتے ہیں۔

ان آیات اور ان جیسی دوسری آیات میں اگرچہ بظاہر مُشرکین کے معبودان باطل کی بے بسی اور عاجزی ظاہر کرکے صرف شرک فی الاستعانت کا رد کیا گیا ہے، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، چوں کہ عبادت عموماً نفع وضرر ہی کے عقیدہ سے اور استعانت ہی کے راستہ سے پیدا ہوتی ہے اس لیے انہی آیات سے شرک فی العبادت کا بھی رد ہوتا ہے۔ اور اسی طرح جن آیات سے براہ راست صرف شرک فی العبادت کا رد کیا گیا ہے اس

بارش لزوم کی وجہ سے انہوں نے بالواسطہ شرک فی الاستعانت کا بھی ارتکاب کیا۔ وہ

بہرحال مشرکین عرب جو قرآن مجید کے پیغام توحید کے اولین مخاطب تھے ان کا جو اول درجہ کا شرک تھا وہی شرک فی العبادت اور شرک فی الاستعانت تھا اور اس لیے "لاالٰہ الا اللہ" کے ذریعے ان کو جس توحید کا پیغام دیا گیا اس کا اولین مطالبہ ان سے یہی تھا کہ وہ عبادت اور استعانت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور خود ہم سے بھی ہر نماز کی ہر رکعت میں اسی کا اقرار ان لفظوں میں کرایا جاتا ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ	اے اللہ ہم صرف تیری ہی عبادت
نَسْتَعِينُ ۝	کرتے ہیں اور تیری ہی سے مدد

کریں گے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگیں گے۔

توحید کا پہلا درجہ بہرحال اللہ تعالیٰ کو ذات وصفات میں واحد و یکتا ماننے کے بعد عملی زندگی میں یہ "توحید فی العبادت" اور "توحید فی الاستعانت" توحید کا وہ ضروری اور اولین درجہ ہے کہ اس پر ایمان لائے اور اس کو اختیار کیے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا اور جو کوئی توحید کے اس درجے سے بھی خالی ہاتھ گیا اور ایسے حال میں مرا کہ وہ اللہ کی ذات وصفات یا عبادت و استعانت میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرتا تھا تو اللہ نے جنت اس پر حرام کر دی ہے۔

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ	بے شک جو شرک کرے گا اللہ کے ساتھ
فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ	تو حرام کر دی ہے اللہ نے اس پر جنت
الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ (المائدہ)	اور دوزخ ہی ہوگا اس کا ٹھکانہ۔

اور یہی وہ شرک عظیم ہے جس کو اللہ ہرگز نہیں بخشے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ	یقیناً اللہ نہیں بخشے گا شرک کو اور
بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ	بخشے گا اس سے ورے کے گناہ
ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء ۱۰۶)	جس کے چاہے گا۔

توحید کے ثانوی مطالبے

پھر آدمی جب توحید کے اس اوّلی اور ابتدائی مطالبہ کو پورا کرے اور یہ درجہ اسکو حاصل ہوجائے تو اس کے بعد اس کے کچھ اور بھی اہم مطالبے ہیں جن کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی مثلاً یہ کہ وہ فیصلہ کرلے کہ مجھے صرف اللہ کے حکم پر چلنا ہے اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنا ہے، اس کے حکم کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے طریقہ یا قومی رسم و رواج یا حکومت وقت کے قانون یا دنیا والوں کی رائے یا خود اپنی مصلحت اور جی کی خواہش کو یا دوسرے لوگوں کی پسند اور خوشی کو نہیں دیکھنا ہے بلکہ اس کے حکم کے مقابلہ میں ان سب چیزوں کو پس پشت ڈال کر بس اس کے حکم اور اس کی مرضی پر چلنا ہے۔ بہرحال تکمیل توحید کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنی پوری زندگی میں یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ ہی کے حکم پر چلنے کا فیصلہ کرے اور ہر حال میں اس کی اطاعت اور غلامی کو اپنا اصول زندگی بنائے۔

آیات ذیل میں توحید کے اسی درجہ کا بیان ہے:۔

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ	کیا تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنی
ھَوَاہُ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ	ہوا و ہوس کو اپنا معبود بنالیا ہے
الْھُدٰی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَ	کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی
ھُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَکَ	ہدایت ہے اور اگر تو نے ان کی

مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ	خواہشات اور ان کے من مانے
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ	خیالات کی پیروی کی بعد اس
(بقرہ ۱۲۰)	کے کہ آپکا تیرے پاس حقیقی علم آ تو

نہیں ہوگا تیرا کوئی حمایتی اور مددگار۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ	کہدو! اللہ کی ہدایت ہی ہدایت
الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ	ہے اور ہم کو حکم ہو کہ رب العالمین
لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ	ہی کی فرمانبرداری کریں۔

(الانعام ع ۹)

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ	پیروی کرو اس کی جو تمہاری طرف
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا	اتارا گیا ہو تمہارے پروردگار
مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ	کی طرف سے اور نہ پیروی کرو اس
(الاعراف ع ۱)	کے سوا اور رفیقوں کی۔

ان آیات کا مطالبہ ایمان والوں سے یہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صرف اللہ کی ہدایت کے تابع کردیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں بس اسی کے حکم پر چلیں۔ یقیناً بہت سوں کے لیے توحید کا یہ مطالبہ مشکل اور سخت ہے، لیکن کوئی شبہ نہیں کہ "لا الٰہ الا اللہ" ان سے یہی چاہتا ہے، اور اس کے بغیر ان کا ایمان و اسلام کامل نہیں ہے

چو می گویم مسلمانم بلرزم   کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

اسی طرح توحید کا ایک تکمیلی مطالبہ ایمان والوں سے یہ بھی ہے کہ اسی کی قادر و قیوم ذات پر وہ توکل و بھروسہ رکھیں اور اسی کو اپنا حافظ و ناصر اور ملجا و ماویٰ سمجھیں،

اسی سے خیر اور بھلائی کی امیدیں رکھیں صرف اسی کے غضب اور قہر سے ڈریں[1] اور اس کی نصرت و اعانت کے اعتماد پر دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت کی بھی پروا نہ کریں۔

وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ	اور نہیں ڈرتے ہیں وہ اللہ کے سوا
(سورۂ احزاب)	کسی سے ○

موحد کہ در پائے ریزی زرش
دگر ارّہ مے نہی بر سرش

امید و ہراسش نہ باشد ز کس
ہمیں است بنیاد توحید و بس

الغرض یہ سب بھی "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" کے اہم مطالبات میں سے ہے اور جس شخص میں جتنی کمی اس بارہ میں رہے گی سمجھنا چاہیئے کہ اس کی توحید اتنی ہی ناقص اور ادھوری رہے گی اور وہ اسی حساب سے شرک میں گرفتار رہے گا۔ اور جس میں یہ باتیں جس قدر کامل درجہ میں ہوں گی اس کی توحید بھی اتنے ہی کامل درجے کی ہو گی۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی مناسب ہو گا کہ مادہ پرست اور خدا فراموش یورپ میں ہیرو پرستی، قوم پرستی اور وطن پرستی کی قسم کی جو گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں اور جس طرح ان

---

[1] واضح رہے کہ غیر اللہ سے صرف وہی ڈرنا اس توحید کے منافی ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی شان "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ" سے ناآشنائی یا کم اعتقادی کی وجہ سے ہو، جیسا کہ عام طور سے ضعیف الایمان لوگوں کا حال ہوتا ہے ورنہ کسی خوفناک مخلوق مثلاً درندہ یا سانپ سے یا کسی بیدرد اور ظالم حاکم وقت سے صرف طبعی طور پر ڈرنا تو انسانی فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے اور یہ توحید کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے بھی منافی نہیں ہے — ۱۲

کو خود پورا بت یہ سب بھی شرک ہی کی ذریات ہیں اور اسلام "لا الٰہ الا اللہ" ہی کی شریعت ان نئے "معبودوں" کو بھی مٹانا چاہتا ہے۔

مثلاً اپنے قومی ہیروؤں کی متعلق اور غیر مشروط پیروی کرنا، ان کے مجسّمے نصب کرانا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے سامنے تعظیم و عقیدت کے مظاہرے کرنا، سلامی دینا، سر جھکانا اور ان پر ہار پھول چڑھانا۔ اور قومی و اجتماعی معاملات میں قانونِ الٰہی سے بے پروا ہو کر اپنے خدا ناشناس لیڈروں کی پیروی کرنا، تو ہیرو پرستی اور لیڈر پرستی کی یہ سب صورتیں بھی لا الٰہ الا اللہ کے پیغام توحید کے قطعاً منافی ہیں، اور اسلام میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

علیٰ ہذا یورپ نے قوم اور وطن کو آج "الٰہ" کی جو حیثیت دے رکھی ہے اور جس طرح اس کی عظمت و تقدیس کے گیت گائے جاتے ہیں اور اپنی اپنی قوم اور اپنے اپنے وطن کی سربلندی کو ان پرستاران قوم و وطن نے جس طرح "نصب العین" اور مقصدِ حیات کا درجہ دے رکھا ہے اور حق و باطل، صالح و فاسد سے قطع نظر کر کے قوم و وطن کی وفاداری کو جس طرح ایک مستقل "دین" بنا لیا گیا ہے (اور مسلمانوں میں بھی یہ سب گمراہیاں بڑی تیزی کے ساتھ سرایت کرتی جا رہی ہیں) تو یہ سب بھی اسلام کے نقطۂ نظر سے ایک طرح کا شرک ہی ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یورپ کے تراشے ہوئے یہ نئے بت (ہیرو، قوم، وطن وغیرہ) ایک لحاظ سے پتھر کے پرانے بتوں سے بھی زیادہ فتنہ انگیز ہیں، اقبالؔ نے سچ کہا ہے کہ ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنائی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال ہی نے اس بارہ میں ایک دوسری جگہ کہا ہے ؎

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداخت است — تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب
نام او رنگ ست وہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند — پیش پائے ایں بتِ ناارجمند
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل — گرمیِ خونت ز صہبائے خلیل
بر سرِ ایں باطلِ حق پیرہن
تیغِ "لا موجودَ اِلّا ہو" بزن

توحید کا اعلیٰ درجہ پھر اس سے بھی آگے توحید کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ ہی سے لو لگائیں اور اسی کو اپنا حقیقی محبوب اور مقصود و مطلوب بنائیں پھر اس کے عشق و محبت میں ہم ایسے فنا ہوں کہ جو کچھ کریں صرف اسی کے لیے کریں اور اس کی رضا کے سوا ہر چیز کی خواہش ہمارے قلب سے نکل جائے[1] پھر ہمارا ہر عمل

---

[1] امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں توحید کے اسی درجہ کے متعلق ارقام فرماتے ہیں :۔ "توحید عبارت از تلخیصِ قلب است از توجہ ما دون او سبحانہ، تا زمانیکہ دل را گرفتاری

(باقی ص۲۰ پر)

سے یہ منا تو یا مذہ ہی نہیں بلکہ ہمارا کھانا اور پینا، سونا اور جاگنا، رونا اور ہنسنا کسی سے خوش ہونا یا ناخوش ہونا اور زیادہ جامع لفظوں میں ہمارا مرنا اور جینا سب اللہ کے لیے اور صرف اسی کی رضا کے واسطے ہو گیا کہ "محیای و مماتی للہ رب العالمین" ہمارا حال ہو اور ہمارے دل کی یہ پکار ہو سے

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و برائے تو زیم

توحید کامل کے آثار و نتائج

جب اللہ کے کسی بندے کو توحید کا یہ اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ہر کام

(صفحہ ۱۹ کا بقیہ حاشیہ)

بما سوا تعلق اگرچہ اقل قلیل باشد از ارباب توحید نیست۔ (مکتوب نمبر ۱۱۲ جلد اول)

اور سیدنا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ "فتوح الغیب" میں فرماتے ہیں:۔

"لیس الشرك عبادة الاصنام بل هو متابعتك نهواك وان تختار مع ربك عزوجل شيئا سواه من الدنيا وما فيها والاخرة وما فيها فما سواه عزوجل غيره فاذا ركنت الى غيره فقد اشركت به عزوجل غيره۔ (فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

مطلب یہ ہے کہ صرف بت پرستی ہی شرک نہیں ہے بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ تو اپنی خواہش نفس کا تابع ہو جائے اور اپنے پروردگار کے ساتھ تو دنیا یا آخرت کی کسی اور چیز کو اختیار کرے، پھر جب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف تیری حاجت کا میلان ہوا تو گویا تو نے اس کے ساتھ اس کے غیر کو شریک کرلیا۔

صرف اللہ کے لیے ہونے لگتا ہے، حتیٰ کہ بظاہر اگر وہ اپنے ذاتی اور خانگی کام بھی کرتا ہو تو وہ بھی محض اپنی ضرورت کے احساس اور نفسانی تقاضے سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی نیت سے اور اسی کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اور یہ بات (یعنی ہر چھوٹا بڑا کام رضائے الٰہی ہی کے لیے کرنا) اس بندہ خدا کے لیے بالکل ایسی طبعی بات ہو جاتی ہو جس طرح عوام الناس ہر کام اپنی ضرورت سے اور اپنے نفس کی خواہش سے کرتے ہیں،[1] یہ درجہ توحید اور اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے اور یہی مقام فنا ہو اور اسی مقام پر پہونچ کے "لا الٰہ الا اللہ" کی تکمیل ہوتی ہے، حدیث میں ہے۔ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ (رواہ ابوداؤد عن ابی امامۃ مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہو کہ جس نے اللہ کے لیے محبت کی (جس سے محبت کی) اور اللہ کے لیے بغض رکھا (جس سے بغض رکھا) اور اللہ ہی کے لیے دیا (جس کو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے لیے

---

[1] امام ربانیؒ اپنے ایک مکتوب گرامی میں ان اہل اللہ کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"اولیاء اللہ ہرچہ کنند برائے حق می کنند جل وعلا نہ برائے نفس خود، چہ نفس ایشاں فدائے حق شدہ است، در خصوص اخلاص و تصحیح نیت ایشاں را در کار نیست، نیت ایشاں بر فنا فی اللہ وبقا باللہ تصحیح یافتہ است، مثلاً شخصے کہ گرفتار نفس خود است، ہرچہ می کند برائے نفس خود می کند نیت کند یا نہ کند وچوں ایں گرفتاری نفس زائل شود و گرفتاری حق جل وعلا بجائے آن نشیند ناچار ہرچہ کند برائے حق کند، نیت دست دہد یا نہ، نیت در محل در کار است در تحقیق احتیاج بہ تعیین نیت ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔" (مکتوب نمبر ۶۹ جلد اوّل)

دینے سے، قیدو بند دشمنوں کو دینے سے (ہاتھ روکنے)، غرض جن کا یہ حال ہو گیا کہ وہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے کرنے لگے، تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

اللہ کے جن بندوں کو اس نسبت کا کچھ حصہ مل گیا، ان کو کونین کی سب سے بڑی دولت مل گئی یہی وہ "مردانِ خدا" ہوتے ہیں جن کو راہِ خدا میں راحت و مصیبت بالکل یکساں ہوتی ہے اور زندگی کو موت سے زیادہ محبوب و مرغوب نہیں ہوتی، ان کے دل کے ساز سے ہر وقت یہ آواز نکلتی ہے۔

زندہ کنی عطائے تو   در بکشی قضائے تو
دل شدہ مبتلائے تو   ہر چہ کنی رضائے تو

بلکہ وہ اللہ سے آرزو کرتے ہیں کہ انھیں بار بار زندگی دی جائے تاکہ وہ بار بار راہِ خدا میں قربان ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اسی جذبہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

وَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ	میرا جی چاہتا ہے کہ راہِ خدا میں
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ	مجھے شہید کیا جائے، پھر مجھے زندہ کیا جائے
اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ	اور پھر میں شہید کیا جاؤں، پھر میں جلایا
اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ۔	جاؤں اور پھر شہید کیا جاؤں۔

میخواہم از خدا بدعا صد ہزاراں جاں
تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو

اہلِ توحید کا فولادی عزم اور طاقت انقلاب

یہی وہ مستِ الست ہوتے ہیں کہ مشکلات اور خطرات ان کا

راستہ نہیں روک سکتے بلکہ وہ کسی خطرے کو خاطر ہی میں نہیں لاتے ؎

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست — اصل عشق از آب و باد و خاک نیست

در جہاں ہم صلح ہم پیکار عشق — آب حیواں تیغ جوہر دار عشق

از نگاہِ عشق خارا شق شود

عشقِ حق آخر سراپا حق شود

ان عشق بازوں کے زورِ ید اللّٰہی کا کون اندازہ کرسکتا ہے یہ مردانِ خدا اور فقیرانِ بے نوا جن کے پاس اللہ کے نام اور قلب میں لا الٰہ الا اللہ کی طاقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا جب محض اللہ کے لیے وقت کے ظالموں اور جابروں سے ٹکراتے ہیں تو بڑے بڑے فرعون و نمرود اُن کے سامنے لرزہ براندام نظر آتے ہیں ؎

با سلاطیں می فتد مردے فقیر — از شکوہ بوریا لرزد سریر

از جنوں می افگند ہوئے بشہر — وارہاند خلق را از جبر و قہر

قلب او را قوت از جذب و سلوک

پیشِ سلطاں نعرۂ او "لا ملوک"

یہ بندگانِ خدا چونکہ اپنی ہستی کو بالکل مٹا دیتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں صرف اللہ کے لیے اور اللہ کی طرف سے کرتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے اقدامات اور ان کے افعال کو اپنی طرف منسوب فرمالیتا ہے اور پھر ان کی لاج رکھتا ہے، حدیث قدسی میں "حتی کنتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّذِیْ یَبْطِشُ بِہٖ[1] او کما قال ع) اسی حال کی تعبیر ہو۔ یہی وہ خاصانِ خدا ہوتے

---

[1] یہ ایک صحیح حدیث ہو جس کا مطلب یہ ہو کہ بعض نسبتے قربِ الٰہی کے مقامات (باقی صد ۲۴ پر)

ہیں جن کے متعلق حدیث نبوی میں ہے کہ اگر یہ اللہ پر کوئی قسم کھا بیٹھیں تو پھر اللہ ان کی قسم پوری کرے: ہو (لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ) تاکہ ان اہم لا الٰہ الا اللہ کے ان مقام کی حقیقت اس کے جلال و قوت اور اس کی کارفرمائیوں اور کرشمہ کاریوں سے کچھ آشنا ہی ہو جائیں۔

توحید کا یہ درجہ، کہ بندہ کی مراد اور اس کا محبوب اور مقصود و مطلوب حق تعالیٰ کے سوا کچھ نہ رہے، اگرچہ عام نہیں ہے اور نہ ایمان و اسلام یا نجات اس پر موقوف ہے (بلکہ یہ صرف کمال ایمان کا درجہ ہے[1] جیسا کہ ابوامامہ کی مذکورہ صدر حدیث کے لفظ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ سے بھی ظاہر ہے) لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہے اتنی بڑی دولت کہ اگر جانیں اور عمریں کھپا کے اور دنیا کی ساری لذتیں اور راحتیں

(بقیہ حاشیہ ص۲۳) طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہونچ جاتے ہیں کہ ان کے کان ان کی آنکھیں اور ان کے ہاتھ ان کے نہیں رہتے بلکہ وہ چونکہ صرف اللہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں اس لیے ان کی یہ ساری قوتیں گویا اللہ کی ہو جاتی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ یہ لوگ خدا ہو جاتے ہیں یا خدا ان کا جزو ہو جاتا ہے —— ۱۲

---

[1] حضرت امام ربانیؒ ایک مکتوب میں تصریح فرماتے ہیں۔

"و این قسم نفی آلہہ، متکثرہ نمودن و از نفی مقصودیت بنفی معبودیت غیر آمدن تمرۂ کمال ایمان است کہ بولایت مربوط است" (مکتوب نمبر ۱۲ جلد سوم)

ہمیشہ کے لیے قربان کرکے بھی حاصل ہو سکے تو بڑی ارزاں ہے اور حاصل نہ کرنے والے بڑے ہی محروم اور بے نصیب ہیں، مگر اس راہ کے عارفوں کا بیان ہے کہ اگر طلب صادق ہو، اور کوشش صحیح طریقہ پر ہو تو یہ بہت زیادہ مشکل الحصول بھی نہیں ہے کہ ہم اس کی آرزو اور اس کے لیے کوشش بھی نہ کر سکیں بلکہ ارباب ہمت کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے اور سچے طالبوں کو خود اللہ کی رحمت اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ اس رحیم و کریم نے اپنے ذمے لکھ دیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا	اور جو لوگ ہمارے راستے میں کماحقہ
لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا	جد وجہد کریں ہم ضرور ان پر اپنے راستے

کھولیں گے۔

وَیَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ	اور جو رخ کر لیتا ہو اللہ کی طرف
یُّنِیْبُ ۝	اس کو اللہ راستے پر لگا ہی دیتا ہے۔

بہرحال اگر سچی انابت ہو اور جہد و قربانی کماحقہ اور صحیح طریق پر ہو تو پھر محروم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ بالکل سچی ترجمانی کی ہے سنۃ اللہ کی جس نے کہا ہے ؎

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن — ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن
یک صبح باخلاص بیا بر در من — گر کار تو بر نیاید گلہ کن

توحید کامل کے مقام تک پہنچنے کے لیے ابتدائی نصاب

آپکے واسطے اس منزل مقصود کی طرف جانے کے لیے صحیح تر راستہ تو وہی ہوگا جو اس منزل کا کوئی شناسا اور اس راہ کا کوئی راہبر آپکے لیے تجویز کرے لیکن ہم جیسے مبتدیوں کے لیے ایک عمومی تدبیر جس

یہ ان شاء اللہ کوئی خطرہ اور رخنہ نہیں ہے اور جو اس راہ کے جاننے والوں ہی کی بتلائی اور لکھی ہوئی ہے، یہ بھی ہے کہ اس حقیقت کا دھیان کرکے کہ "اللہ کے سوا کوئی مقصود و مطلوب نہیں" اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کی کثرت کی جائے۔ یعنی تسلسل اور تکرار کے ساتھ دل اور زبان ہم آہنگ ہو کے الا پا کریں "لا الٰہ الا اللہ" (اللہ کے سوا کوئی مقصود و مطلوب نہیں) اس معنی کے دھیان کے ساتھ اس ذکر کی کثرت ہی سے انشاء اللہ یہ کیفیت پیدا ہونے لگے گی اور خدا نے چاہا تو ترقی کرتی جائے گی ؎

(تنبیہ) سطور بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کو اس مقصد عظیم (یعنی "توحید حقیقی" اور "اخلاص" کے اعلیٰ مقام کے حصول) کا پورا نصاب نہ سمجھا جائے۔ یہ تو اس راہ کے بعض رہبروں نے محض ابتدائے کار کے لیے لکھا ہے، گویا یہ صرف بسم اللہ ہے ورنہ اس راستے کے طے کرنے کے لیے عام طور پر اللہ کے کسی صاحب اخلاص بندہ کی رہنمائی اور نگرانی کی ضرورت ہوتی ہی ہے وہی سالک کے حالات کی رعایت رکھتے

؎ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

"در تحصیل ایں دولت مناسب حال سالک معنی کلمۂ طیبہ لا الٰہ الا اللہ لا مقصود الا اللہ است چنداں تکرار ایں کلمہ باید کہ از معبودیت غیر نامے و نشانے نماند و مراد جز او تعالیٰ ہیچ چیز نماند" (مکتوب نمبر ۳ جلد سوم)

نیز اسی جلد کے تیرھویں مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں۔

"ملتزم ذکر نفی و اثبات باشید۔ و بجمیع مرادات را بتکرار ایں کلمۂ طیبہ از ساحت سینہ برآرید تا مقصود و مطلوب و محبوب بجز یکے نباشد" (مکتوب نمبر ۱۳۔ جلد سوم)

ہوئے ہر موقع اور ہر منزل پر صحیح مشورے دے سکتا ہے، بلکہ ائمۂ فن نے تصریح کی ہے کہ "تزکیۂ قلب" اور "تحصیلِ مقام قرب و اخلاص" کے بارہ میں ذکر کا جو اثر ہوتا ہے وہ بھی (مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) کسی صاحب دل شیخ کی تلقین اور نگرانی کی وجہ سے اور صحبت کی برکت سے قوی تر اور تیز تر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ذکر کے اجرِ اخروی میں اس کی وجہ سے کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوتی۔ [۱]

بہرحال اس راستہ میں کسی واقف رسم و راہ بندۂ خدا کی رہنمائی اور صحبت عام حالات میں قریب قریب ضروریات ہی میں سے ہے۔ اس کے بغیر "حقیقی اخلاص" کا حصول اور اس میں استقامت، جیسا کہ اس راہ کے تجربہ کاروں نے لکھا ہے اخص الخواص ہی کا حصہ ہے اور مستثنیات میں سے ہے، سچ کہا ہے کہنے والے نے ؂

دیں مگر دو پختہ بے آدابِ عشق　　دیں بگیر از صحبتِ اربابِ عشق
ظاہر او سوزناک و آتشیں　　باطنِ او نورِ رب العالمین (اقبال)

یہاں تک تو "لا الٰہ الا اللہ" کے معنی اور توحید کے درجات اور ان کے متعلقات کا بیان تھا، اب آخر میں اس مبارک اور مقدس کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی عظمت اور اہمیت کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات نقل کیے جاتے ہیں۔ یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی بھی اس کلمہ کی عظمت و اہمیت کا عارف نہیں ہو سکتا۔

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث

---

[۱] ملاحظہ ہو مکتوباتِ امام ربانی، جلد سوم مکتوب بست و پنجم ۲۵ ص ۱۲۰

میں بھی ایک مشہور حدیث مروی ہے جس کا پہلا جز یہ ہے۔

اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ	ایمان کے ستر سے بھی کچھ اوپر شعبے ہیں
شُعْبَۃً فَاَفْضَلُہَا قَوْلُ	ان میں افضل ترین شعبہ
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔	لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے۔

(۲) مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ کتب حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ ہی کی روایت سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ:۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!
عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَدِّدُوْا	کہ اپنے ایمانوں کی تجدید یعنی ان کو تازہ
اِیْمَانَکُمْ قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ	کرتے رہا کرو صحابہؓ نے عرض کیا۔
وَکَیْفَ نُجَدِّدُ اِیْمَانَنَا؟	یارسول اللہ ہم کس طرح اپنے ایمان
قَالَ اَکْثِرُوْا مِنْ قَوْلِ	کی تجدید کیا کریں؟ آپ نے فرمایا۔۔۔
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔	"لا الٰہ الا اللہ" کثرت سے پڑھا کرو۔

(۳) حضرت جابرؓ کی مشہور حدیث ہے جو ابن ماجہ اور نسائی وغیرہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

تمام اذکار میں افضل و اعلیٰ لا الٰہ الا اللہ ہے۔

(۴) اور نسائی اور حاکم اور بیہقی وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے ایک حدیث قدسی روایت کی ہے، جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:۔

لَوْ اَنَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعَ	اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں
وَالْاَرْضِیْنَ السَّبْعَ فِیْ کِفَّۃٍ	ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور
وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فِیْ کِفَّۃٍ	لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں
مَالَتْ بِھِمْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔	تو لا الٰہ الا اللہ والا پلڑا ہی بھاری ہو گا۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وسلم)

کلمۂ طیبہ کا

دُوسرا جزء، رسالتِ محمدیؐ

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں، اُس کے پیغمبر ہیں)

توحید کے بعد اسلام کی دوسری بنیاد سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا اور اس کی شہادت دینا ہے۔

رسالت کی حقیقت اور پیغمبری کے منصب کو سمجھنے کے لیے اور بالخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلہ میں جو ممتاز مقام ہے، اُس سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مندرجہ ذیل مقدمات کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

(۱) "لا الٰہ الا اللہ" کہہ کے ہم نے توحید کی شہادت دی تھی اور اپنے اس اعتقاد و ایمان کا اعلان اور اس حقیقت کا اعتراف کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا معبود ہے۔ لہٰذا ہم اس کی اور صرف اسی کی عبادت کریں گے اور وہی ہمارا مالک اور حقیقی بادشاہ

ہے، لہٰذا اُس کے اور صرف اُسی کے حکموں پر چلیں گے، اور وہی ہمارا مقصود و مطلوب ہو اس لیے اسی کی رضا جوئی کو ہم اپنا نصب العین اور مقصدِ حیات بنائیں گے، اُسی کے لیے جئیں گے اور اُسی کے لیے مریں گے۔

(۲) لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح طریقہ معلوم ہو، اور اُس کے ان احکام کا بھی علم ہو، جن پر وہ ہم کو چلانا چاہتا ہو، اور اس کی رضامندی و ناراضی کے اُصول و موجبات سے بھی ہم باخبر اور اس کے تقرب کی راہوں سے بھی ہم آشنا ہوں، ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے شروع دنیا سے نبوت و رسالت کا مقدس سلسلہ جاری کیا اور انہی چیزوں کی تعلیم و ہدایت کے لیے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں اور قوموں میں اس نے اپنے رسول بھیجے، جنھوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی امتوں کو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کرائی، توحید کا درس دیا اور اس کی ذات و صفات اور مبدا و معاد کے متعلق عقائد صحیحہ کی تلقین کی، نیز اللہ کی عبادت کے صحیح طریقے ان کو بتلائے اور معاملات و معاشرت وغیرہ کے بارہ میں اس کے احکام و قوانین اُن تک پہونچائے اور رضائے الٰہی و قرب خداوندی کی طرف جانے والے راستہ کو ان کے لیے روشن کیا (صلوٰۃ و سلام ہو اُن سب پر)

(۳) لیکن اب سے دو ڈھائی ہزار برس پہلے تک دنیا میں بسنے والی قومیں چوں کہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ اپنے اپنے علاقوں میں محدود اور مقید تھیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں آمد و رفت اور میل جول کی جو صورتیں بعد میں پیدا ہوئیں، اُس وقت تک وہ وجود میں نہیں آئی تھیں جس کی وجہ سے مختلف ملکوں میں رہنے والی قوموں کے مزاج اور احوال میں غیر معمولی فرق تھا، اس لیے

اُس وقت تک جتنے پیغمبر آتے تھے وہ عموماً اپنے اپنے ملکوں اور اپنی اپنی قوموں ہی کی ہدایت کے لیے آتے تھے۔ نیز اُس وقت تک عام انسانوں کی اندرونی صلاحیتیں بھی نامکمل تھیں، گویا انسانیت ابھی نابالغ اور سن طفلی میں تھی اور کسی کامل و مکمل دین کے تحمل کے قابل نہیں ہوئی تھی، اس لیے ان پیغمبروں کے ذریعے اللہ تعالیٰ جو احکام اور جو قانون و دستور ان قوموں کے لیے بھیجتے تھے اس میں ان کے مخصوص مزاج اور احوال کی رعایت کے ساتھ ان کی اندرونی صلاحیت اور قدر برداشت کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے ان کی شریعتوں میں احکام کی کمی بیشی، اجمال و تفصیل اور سختی و نرمی کے لحاظ سے باہم کچھ فرق بھی ہوتا تھا۔

نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ چلتا رہا، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اُس کی طرف سے کتنے پیغمبر، کن کن قوموں میں کس کس وقت آئے۔ ان میں سے چند پیغمبروں کے نام اور ان کے کچھ حالات و واقعات بھی ہم کو قرآن مجید میں بتلائے گئے ہیں اور ساتھ ہی تصریح کر دی گئی ہے کہ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے پیغمبر ہم نے مختلف قوموں میں بھیجے ہیں۔ (ہم ان سب انبیاء و رسل کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کی ہدایت و رہنمائی اور پیغمبرانہ مساعی کا اعتراف اور ان کی تعظیم و توقیر کو اپنا دینی فرض جانتے ہیں۔ اللہ کا صلوٰۃ و سلام ہو ان سب پر)

(۴) پھر اب سے کوئی ڈیڑھ ہزار برس پہلے اللہ کے ہزاروں پیغمبروں کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں اور ہزاروں سال کی فطری تدریجی ترقی کے بعد جب انسانوں کی وہ اندرونی صلاحیتیں مکمل ہو گئیں جن کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ہم کو دین کا مکلف کیا ہے، گویا جب انسانیت اپنی دینی استعداد کے لحاظ

سے سن بلوغ کو پہونچ گئی اور اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے اسی زمانہ میں دنیا کی مختلف قوموں اور مختلف ملکوں کے درمیان تعارف اور میل جول کے ایسے اسباب بھی پیدا کرنے شروع کر دیے جن کی وجہ سے علوم و افکار اور اخلاق و عادات ایک قوم سے دوسری قوم میں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف منتقل ہونے لگے اور ایک ملک کی آواز دوسرے ممالک تک پہونچ سکنے کی صورتیں پیدا ہو گئیں۔ الغرض جب اس طور سے وہ دنیا جو بہت سے الگ تھلگ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی "ایک دنیا" بن گئی، تو وقت آگیا کہ پوری دنیا کے لیے ایک ہی کامل و مکمل دین اور ایک ہی دستور و آئین بھیجدیا جائے اور سب ملکوں اور ساری قوموں کے لیے ایک ہی رسول مبعوث کیا جائے۔

(۵) پس اسی فطری تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ نے جزیرہ نمائے عرب کے مرکزی شہر مکہ معظمہ[۱] میں سرورِ کائنات رحمتِ عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کیلئے رسول اور ساری قوموں کے واسطے ہادی بنا کے بھیجا اور حکم دیا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو پیغام دو۔

---

[۱] آپ ڈیڑھ ہزار برس پہلے کی دنیا کا نقشہ اور اُس وقت کی مختلف قوموں کی تاریخ سامنے رکھیں تو بڑی آسانی سے یہ چیز آپ کی سمجھ میں آسکتی ہو کہ ساری دنیا کی پیغمبری کیلئے اُس وقت عرب کے ایک انسان کا انتخاب کیوں کیا گیا۔ مندرجہ ذیل حقیقتوں پر ذرا غور کیجئے۔

(الف) عرب کا ملک ایشیا اور افریقہ کے بالکل وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے قریب ہی ہے، بالخصوص اس کا وہ جنوبی حصہ جس میں اُس زمانہ کی متمدن قومیں زیادہ تر آباد تھیں عرب سے تقریباً اسی فاصلہ پر ہے جتنے فاصلہ پر کہ ہندستان ہے، الغرض اوّلاً تو (باقی اگلے صفحہ پر)

قُلْ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ
اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ۨالَّذِیْ
لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ
یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ
الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ
بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ وَاتَّبِعُوْہُ
لَعَلَّکُمْ تَہْتَدُوْنَ
(الاعراف ۔ ع ۲)

کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف
اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی
بادشاہی ہے زمین اور آسمانوں میں۔
اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں
وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا
سو پس اسی اللہ پر ایمان لاؤ اور اس
کے رسول نبی امی پر جو خود اللہ اور
اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہے اور
اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت
پا جاؤ۔

(صفحہ ۳۳ کا بقیہ حاشیہ) اس مخصوص جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے عالمگیر پیغمبری کے لیے اس وقت عرب ہی موزوں ترین مقام ہو سکتا تھا۔

(ب) ثانیاً یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ اس زمانہ کی تمام قوموں میں عرب قوم ہی چند ایسے عادات و خصائل اور امتیازی اوصاف اپنے اندر رکھتی تھی جو اتنے بڑے کام کے لیے ضروری تھے۔ مثلاً اس کا دل و دماغ صاف اور اس کی زندگی سادہ تھی، اور کسی فلسفہ اور کسی نظام فکر اور کسی تمدن کی جڑیں اس کے دل و دماغ کی زمین میں جمی ہوئی نہ تھیں، جن کا اکھاڑنا اور ان کی جگہ نئے فلسفہ اور نئے تمدن کو جمانا مشکل ہوتا۔ نیز یہ قوم کسی سیاسی نظام کی بندشوں میں جکڑ بند نہ ہونے اور غلامی کی ہوا سے بھی محفوظ رہنے کی وجہ سے (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

اور چوں کہ انسانیت اپنی دینی استعداد کے لحاظ سے کامل ہو چکی تھی[۱]۔ اور اس میں کامل و مکمل دین کے تحمل کی صلاحیت آچکی تھی اس لیے اسی بنی امی کی تعلیم کے ذریعے

(صفحہ ۳۴ کا بقیہ حاشیہ) بڑی بلند حوصلہ بے پناہ عزم و ہمت کی مالک، نہایت خود دار اور غیور، شجاعت پیشہ اپنی بات کے لیے بے دریغ اور بے حساب قربانیاں کرنے والی، سخت جفاکش اور مشکلات سے کبھی نہ منھ موڑنے والی، اور اپنی فطرت میں نہایت قابل و تابناک جوہر رکھنے والی قوم تھی، تاریخ ان سب حقیقتوں کی گواہ ہے، اور عربوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد جو کچھ دنیا میں کرکے دکھایا وہ ہمارے اس بیان کا روشن ثبوت ہے۔

(ج) پھر اس قوم کے پاس ایک نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ زبان تھی جو کسی عالمگیر اصلاحی انقلاب کا ذریعہ بننے کے لیے اس وقت کی تمام دوسری زبانوں سے زیادہ صلاحیت رکھتی تھی اور آج بھی اس کی یہ خصوصیت جوں کی توں باقی ہے۔ کسی غیر عربی داں کے لیے عربی زبان کی اس خصوصیت کا اندازہ کرنا تو مشکل ہوگا۔ لیکن عربی داں جانتے ہیں کہ اس زبان میں کس بلا کی طاقت اور کسی دعوت کا ترجمان اور ذریعۂ تبلیغ بننے کی کتنی اعلیٰ صلاحیت ہے۔

بہرحال یہ وہ وجوہات ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہر عقل والا سمجھ سکتا ہے کہ عالمگیر پیغمبری کے لیے ملک عرب اور عربی قوم ہی کا انتخاب ہونا چاہیے تھا۔

[۱] بعد کے زمانوں میں بالخصوص یورپ کی اس نشاۃ ثانیہ کے دور میں علوم و فنون اور ایجادات و انکشافات میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کی وجہ سے کسی کو یہ مغالطہ نہ ہونا چاہیے کہ "انسانی صلاحیت" برابر ترقی پذیر ہے۔ کیونکہ یہ ترقی دراصل تفریعات اور تجربات کی ترقی ہے اور اس کا تعلق مادیات سے ہے اور ہماری گفتگو جس صلاحیت میں ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے اور ہر واقف حال جانتا ہے کہ اس راہ میں یورپ نے ایک انچ بھی ترقی نہیں کی ہے --- ۱۲

دینِ اسلام کی آخری تکمیل بھی کردی گئی اور اعلان فرمادیا گیا۔

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ	آج میں نے تمہارے لیے دین
وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي	کو کامل کردیا اور اپنی نعمت تم
(المائدہ ع ۱)	پر پوری کردی۔[1]

---

[1] قرآن مجید کے اس اعلان اور اس دعوے سے قطع نظر بھی کرلیا جائے تو اسلام کا کامل ومکمل دین ہونا اور کتاب اسلام (قرآن مجید) کا ہرزمانہ اور ہر ملک کے انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کافی ووافی ہونا، ایک ایسی ظاہر وآشکارا اور تجربہ میں آئی ہوئی حقیقت ہے کہ کوئی دشمن بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا، اس عرصے میں کتنے انقلابات آئے، کتنے فلسفے، کتنے نظریے، کتنے نظام اور کتنے ضابطے بنے اور بگڑے اور دنیا نے انھیں فرسودہ اور ناقابلِ عمل قرار دے کر ردی کردیا، لیکن "نبی امی" کا پیش کیا ہوا اسلام اور اس کا صحیفہ قرآن مجید بالکل اپنی جگہ پر ہے۔ اور آج تیرہ سو برس گزرجانے کے بعد بھی اس کا کوئی ذہین سے ذہین دشمن اس کے کسی ایک حکم بلکہ ادنیٰ تبدیلی وترمیم کی ضرورت ثابت نہیں کرسکتا نیز اسلام اور قرآن کے کامل اور دائمی ہونے کا اس سے بھی بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے نہ ماننے والے بھی آہستہ آہستہ اس کے اصولوں کو اختیار کرتے جارہے ہیں، ان اوراق میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے ورنہ بتلایا جاسکتا ہے کہ الٰہیات سے لے کر معاملات ومعاشرت تک میں آج کی "ترقی یافتہ" قومیں اسلام کی کس طرح خوشہ چینی کررہی ہیں اور کس قدر تیز رفتاری سے اسلام کے اصولوں کو اپناتی جارہی ہیں واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام (کامل ومکمل اسلام، دنیا کے کسی خطہ میں اپنی عملی شکل میں اس وقت قائم ہوتا یعنی اسلام (باقی اگلے صفحہ پر دیکھیے)

(۶) پھر دین کی اس تکمیل کے بعد حکمت الٰہی کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ اس دین کو ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی تحریف اور ملاوٹ سے محفوظ کر دیا جائے اور اس کی حفاظت کا ایسا انتظام کر دیا جائے کہ دنیا ہمیشہ ہمیشہ اس سے روشنی حاصل کرتی رہے، چنانچہ قدرت خداوندی نے ایسے اسباب پیدا فرما دیے کہ یہ آخری مکمل دین اور اس کا صحیفہ (قرآن مجید) ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے اور کسی ملاوٹ، کسی تبدیل و ترمیم اور کسی شک و شبہ کے لیے

(صفحہ ۳۶ کا بقیہ حاشیہ) کے اجتماعی اور انفرادی تمام قوانین کا عملی نمونہ کہیں دیکھا جا سکتا. تو یقیناً دنیا کی بہت سی صاحب اقتدار قومیں اس کے زیر سایہ آجانے ہی میں اپنی اور کل انسانیت کی نجات سمجھتیں۔ کاش مسلمان اور مسلمانوں کی حکومتیں اپنے منصب اور اپنی اس خاص ذمہ داری کو سمجھیں۔ ۱۲

ـــــ

ــلــہ قرآن مجید کی یہ حفاظت (اور اس کے ذریعہ دین اسلام کی حفاظت) دین حق کا ایسا معجزہ ہو جو اسلام کے منکروں کے لیے آج بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی حجت اور نہایت روشن دلیل ہو، ذرا غور تو کیجئے قرآن مجید کا طرز بیان عام انسانوں حتیٰ کہ خود اہل عرب کے طرز کلام سے بھی ممتاز اور نرالا ہے اور جس جاہلی ماحول اور جس ظلمانی فضا میں وہ نازل ہوا ہے اس میں اس کے مضامین بھی لوگوں کے لیے اچنبھے کی باتیں ہیں جن سے وہ دیسا مانوس نہیں ہیں، پھر جس ہستی پر وہ نازل ہوا ہے وہ "اُمّی" بے نوشت و خواند سے ناآشنا ہو، خود قرآن کے بیان کے مطابق مَاكُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ اس کا حال ہے، یعنی وہ اپنے قلم سے ایک سطر بلکہ ایک کلمہ لکھنے پر بھی قادر نہیں ہے، بلکہ اس کو اگر کبھی کچھ لکھانا ہوتا ہے تو وہ دوسروں ہی سے لکھایا جاتا ہے، پھر قرآن دس پانچ ورق کا کوئی چھوٹا سا صحیفہ نہیں ہے، بلکہ اچھی خاصی ضخیم کتاب ہے، اور زمانہ پریس کا بھی نہیں ہو کہ جو کتاب ایک دفعہ چھپ جائے وہ محفوظ ہو جائے (باقی اگلے صفحہ پر)

باقی ہی نہیں رہا اور اس حفاظت کی ضمانت کا اعلان قرآن مجید میں بھی فرما دیا گیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ	ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور
وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ	ہم خود ضرور بالضرور اس کی حفاظت
(حجر ع ۱)	کرنے والے ہیں۔

یہیں سے آپ نے یہ بھی سمجھ لیا ہو گا کہ جب دین آخری حد تک مکمل بھی ہو گیا اور محفوظ بھی۔ تو اب دنیا کو کسی نئی نبوت اور نئے ہدایت نامہ کی مطلق ضرورت نہیں رہی۔ لہٰذا نبوت محمدیؐ کے بعد نبوت کا ہر دعوی محض جھوٹ اور افترا علی اللہ ہے۔

جو ایمانی اور تاریخی حقیقتیں مندرجہ بالا تمہیدی سطور میں ذکر کی گئی ہیں (جو ازروئے عقل بھی ثابت اور واجب التسلیم ہیں اور ازروئے نقل بھی) ان سب کا نتیجہ اور ماحصل یہ ہوا کہ

اللہ تعالےٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اور اپنے احکام اور

(صفحہ ۳۰ کا بقیہ حاشیہ) بلکہ صورت یہ ہو کہ جس ملک اور جس قوم میں قرآن نازل ہوا ہو اس میں لکھنے پڑھنے کا رواج بھی بہت کم ہو اس لیے ایسا بھی نہیں کہ اس کے بہت سے مکمل نسخے عہد نبوی میں تیار ہو گئے ہوں۔ بہر حال جس کتاب کی یہ سرگزشت ہو اور جو اسباب حفاظت سے اس قدر تہی دست ہو، اس کتاب کا اس طرح محفوظ رہ جانا جس طرح قرآن مجید محفوظ ہے، اگر معجزہ اور قدرت الٰہی کا خاص کرشمہ نہیں تو کیا ہے؟ — ۱۲

اپنی مرضیات سے اُن کو باخبر کرنے کے واسطے نبوت کا جو سلسلہ ابتدائے دُنیا سے جاری کیا تھا، سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس مقدس و مبارک سلسلہ کی آخری کڑی ہیں (یا خود اپنی تمثیل کے مطابق عمارتِ نبوت کی آخری اینٹ ہیں) حق تعالےٰ کے معتمد نمائندے اور اس کی مرضیات کے سچے ترجمان ہیں، اُن کا پیغام اللہ کا پیغام، اور اُن کی ہدایت اللہ کی ہدایت ہے، لہٰذا اُن کی اطاعت و فرمانبرداری بعینہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور ان کی نافرمانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، کیوں کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اللہ ہی کی طرف سے کہتے ہیں اور اسی کا حکم پہونچاتے ہیں۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ	جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے در حقیقت اللہ ہی کی اطاعت کی
(النساء ۵۶)	
مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحٰى	یہ رسول اپنے جی سے نہیں بولتے بلکہ (جو ہدایت یہ دیتے ہیں) وہ ہماری ہی وحی ہے جو اُن پر کی جاتی ہے۔
(النجم ۱۶)	

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اگر اس کی روشنی میں آپ نے رسالت کی حقیقت اور اس کے مقصد و منصب کو سمجھ لیا ہے تو یہ حقیقت خود بخود آپ پر واضح ہو گئی ہوگی کہ کسی ہستی کو اللہ کا رسول مان لینا، اور اس کی رسالت کی شہادت دینا کیا معنی

رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے آدمی پر کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ تاہم مسلمانوں کی موجودہ غفلت و خود فراموشی کے پیش نظر چند تصریحات ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

کسی کو رسول ماننے کا مطلب اور اُسکے لوازم

آپ نے جب کسی کو "اللہ کا رسول" مان لیا اور اس کی شہادت دی تو درحقیقت آپ نے اپنے لیے اور اپنی رائے میں ساری دنیا کے لیے بہت بڑے اور نہایت اہم چند فیصلے کر ڈالے، ایسے فیصلے کہ ان سے بڑے اور ان سے زیادہ انقلاب آفریں قسم کے کسی فیصلے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا گویا آپ نے اپنے دل و دماغ اور اپنی زبان سے فیصلہ کر دیا، کہ

(الف) خالق کائنات اور فاطر ہستی کے بارے میں، دنیا کے آغاز و انجام کے بارے میں زمین و آسمان اور اس سارے جہان کے بارے میں وہ نبی رسول جو کچھ کہتا ہے اور بتلاتا ہے وہی اور صرف وہی حق اور سچ ہے کیوں کہ وہ اپنی غور و فکر سے نہیں، بلکہ خدائے علیم و خبیر کے بخشے ہوئے علم سے کہہ رہا ہے اور دنیا بھر کے فلاسفہ اور مفکرین و مصنفین بھی اگر اس کے خلاف کہیں یا کہہ رہے ہوں تو وہ سب باطل ہے، جھوٹ ہے، اور اندھوں کی اٹکل پچو ہے۔

(ب) وہ جن ان دیکھی اور ان سنی چیزوں کی خبر دیتا ہے۔ مثلاً فرشتوں کی ہستی اور ان کے اوصاف و افعال بتلاتا ہے، یا مثلاً قیامت آنے اور اس کے بعد حشر برپا ہونے اور پھر آخرت میں حساب کتاب اور جزا سزا کے ہونے کی

خبر دیتا ہے یا جنت و دوزخ کا موجود ہونا اور پھر جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کا اور دوزخ میں انواع و اقسام کے دردناک عذابوں کا ہونا جس تفصیل سے وہ بیان کرتا ہے وہ سب حق ہے، بلا چوں و چرا اُس کا ماننا ضروری ہے، کیونکہ وہ سب باتیں خدا کی طرف سے بتلا رہا ہے۔ لہٰذا اس کی بیان کی ہوئی (بالیقین اس کی بیان کی ہوئی) کسی چیز کے ماننے سے اگر کوئی انکار کرے تو وہ ایمان اور نجات سے محروم ہے۔

(ج) اسی طرح عبادات کے بارہ میں، اخلاق و آداب کے بارہ میں اور تمدن و معاشرت کے بارہ میں جو احکام اُس نے دیے ہیں اور علیٰ ہذا سیاست و جہاں بانی کے بھی جو اُصول و قوانین اُس نے بتلائے ہیں، الغرض انسانی زندگی کے ان تمام شعبوں میں اُس کی جو تعلیمات اور ہدایات ہیں وہ سب بالکل حق ہیں، اٹل ہیں، واجب التعمیل ہیں اور ان کے خلاف جو طور طریقے رائج ہیں، خواہ وہ ہمارے ہی گھروں اور ہمارے ہی خاندانوں میں رائج ہوں اور خواہ ہمارے باپ دادوں ہی کے رائج کیے ہوئے ہوں، اور خواہ دنیا کی کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی یافتہ قوم یا خود ہماری قوم اور ہماری حکومت ان کو اپنائے ہوئے ہو، بہرحال وہ سب غلط ہیں، انسانیت کے لیے مضر اور مہلک ہیں اور اس لیے لائقِ ترک بلکہ قابلِ شکست و ریخت ہیں۔

الغرض کسی کو "اللہ کا رسول" ماننا اگرچہ بظاہر ایک مختصر سی بات ہے، لیکن درحقیقت اپنی ذات اور ساری دنیا کے متعلق یہ تمام اہم فیصلے اس میں مضمر ہیں۔ پس جو شخص کسی رسول کی رسالت کی گواہی اپنی زبان سے دیتا ہے اور اس بنا پر اپنے کو اس کا اُمتی کہتا ہے۔ لیکن اس کا دل ان فیصلوں کے لیے آمادہ نہیں ہے تو درحقیقت وہ بڑے مغالطہ میں ہے اور اس نے رسالت و پیغمبری کا مطلب ہی نہیں سمجھا ہے ــــ کسی نبی و رسول

کی نبوت و رسالت پر ایمان لانے کا تو مطلب ہی یہ ہو کہ ہم نے اس کی ہر تعلیم و ہدایت کو حق اور اس کے خلاف ہر نظریے اور ہر رواج اور ہر دستور کو غلط و باطل مان لیا اور مرضیات الٰہی کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور رہنما تسلیم کر لیا ــــــ قرآن مجید میں بڑی صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ	قسم تمہارے پروردگار کی یہ لوگ
حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ	مومن نہیں ہو سکتے جب تک تم کو
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي	حکم نہ مان لیں اپنے اختلافات میں
أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا	پھر نہ پاویں اپنے دلوں میں تنگی
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا	تمہارے کیے ہوئے فیصلہ سے اور
(النساء ع ۹)	مان لیں اس کو قطعی طور سے مان لینا۔

بہر حال نبی و رسول کی تعلیم و ہدایت کے سامنے آجانے کے بعد "مومن" کو غور و تامل اور ترجیح و انتخاب کا اختیار نہیں رہتا بلکہ اس کا کام صرف مان لینا اور اس کی تعمیل میں لگ جانا ہے اور یہ ماننا بھی صرف قانونی اور جبری قسم کا نہیں، بلکہ دل و جان سے مان لینا، یہی شرط ایمان ہے۔

نبی و رسولؐ کی حیثیت دنیا کے عام مصلحین اور لیڈران قوم کی سی نہیں ہوتی کہ ان کو مصلح اور لیڈر ماننے کے باوجود اختیار رہتا ہو کہ اگر بالفرض ان کی کوئی بات آپ کو مصلحت وقت کے خلاف یا غلط نظر آئے تو اس کو آپ نہ مانیں، بلکہ رسولؐ کی حیثیت جیسا کہ اوپر تفصیل سے بتلایا گیا، اللہ کے صادق اور معتمد نمائندہ کی ہے جس کے متعلق مانا ہوا ہے کہ وہ جو بھی ہدایت دیتا ہے، اللہ ہی کی طرف سے دیتا ہے۔

س لیے اپنی رائے، اپنے جذبے، اپنی پسند اور اپنی خواہش کو اس کا غلام اور محکوم نا دینا شرطِ ایمان ہے[1]۔ قرآن مجید میں صاف اعلان کر دیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ	اور نہیں گنجائش کسی مومن مرد یا مومن
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ	عورت کے لیے اس بات کی کہ جب فیصلہ
أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ	کر دیں اللہ و رسول کسی بات کا تو پھر
مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ	انھیں اختیار رہو اپنے بارے میں
اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ	اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ اور
ضَلَالًا مُبِينًا	اس کے رسول کی تو وہ کھلی ہوئی
(الاحزاب ۵۶)	گمراہی میں پڑ گیا۔

اور حدیث نبوی میں اس سے بھی زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يَكُونَ	تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا

---

[1] اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو کہ اسلام انسانوں کی عقل و رائے کو بالکل بیکار قرار دے کر پیغمبروں کی باتیں خواہ مخواہ ماننے پر اُن کو مجبور کرتا ہو، بلکہ اس بارہ میں اسلام کا جو رویہ ہے وہ درحقیقت نہایت عاقلانہ ہو، اسلام کہتا ہو کہ تم پیغمبر کو پہچاننے میں تو پوری عقل اور فکر و بصیرت سے کام لو، لیکن جب تم خوب سوچ سمجھ کے کسی کو "اللہ کا رسول" مان لو تو پھر اس کی ہر تعلیم و ہدایت کو منجانب اللہ سمجھ کے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ابھی تم نے اس کو رسول مانا ہی نہیں ہو، یا پھر تم رسول کے معنی سے بھی ناآشنا ہو ــــ ۱۲

حتّٰی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ
(مشکوٰۃ)

تاوقتیکہ اس کی خواہش میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع اور موافق نہ ہو۔

درحقیقت منصبِ رسالت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ پیغمبروں کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کیا جائے اور اس کا پورا پورا اتباع کیا جائے جو وہ انسانوں کی ہدایت کے بارہ میں فرمائیں۔

نیز پیغمبروں کی آمد کا مقصد صرف اس سے پورا نہیں ہوتا کہ آپ ان کو صرف دل سے اور زبان سے پیغمبر مان لیں اور ان کی شان میں مدح و ثنا کے قصیدے پڑھا کریں بلکہ پیغمبروں کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا اتباع کیا جائے اور ان کی ہدایتوں پر چلا جائے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ
إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ
(النساء ۔ ۸۰)

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث کیا کہ بحکمِ خداوندی ان کی اطاعت کی جائے۔

پس کسی کو خدا کا رسول ماننا اور اس کی رسالت کی شہادت دینا اپنی عملی زندگی کے متعلق بھی درحقیقت اس بات کا عہد اور اقرار کرنا ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کو اس رسول کی ہدایت اور اس کی لائی ہوئی شریعت کے ماتحت کر دیا اور ہم اس کے پیرو ہو کر ہی جئیں گے اور پیروی کرتے ہوئے ہی مریں گے۔

اور قرآن مجید میں صاف صاف اعلان کر دیا گیا ہے کہ کوئی شخص بغیر اتباعِ رسول کے اللہ کو راضی نہیں کر سکتا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ

کہہ دے رسول اگر تم چاہتے ہو اللہ کو

فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَ   تو اتباع کرو میرا اللہ تمہیں چاہنے
یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (آل عمران)   لگے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

منصب رسالت کے متعلق قرآن مجید کی مندرجہ صدر تصریحات، اور اس کے کھلے لوازم و نتائج کو ذرا دیر کے لیے ذہن میں حاضر کیجئے اور پھر سوچئے کہ "کلمہ طیبہ" میں ہم جو "محمد رسول اللہ" زبان سے کہتے ہیں اور آپ کی رسالت کی جو شہادت دیتے ہیں تو اس کی ذمہ داریوں کو ہم کہاں تک پورا کر رہے ہیں۔ زبان سے اللہ کے کسی نبی و رسول کی نبوت و رسالت کی شہادت دینا اور زندگی بھر اس کے خلاف راستوں پر اطمینان سے چلتے رہنا ایمان نہیں، نفاق ہے۔ اللّٰھم احفظنا

اللہ کے رسولؐ سے محبت

کسی ہستی کو "رسول اللہ" ماننے کے لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ دنیا و مافیہا میں سب سے زیادہ اس کی محبت کی جائے یعنی اللہ کے بعد وہی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہو۔

اچھوں کی محبت چونکہ انسان کی فطرت ہے اور انبیاء و رسل چونکہ سب دنیا کے اچھوں سے اچھے بلکہ سب اچھوں کے سردار اور ساری ظاہری و باطنی خوبیوں کے جامع اور محاسن و کمالات کے پیکر ہوتے ہیں اور وہی دنیا کے سب سے بڑے محسن اور ہمدرد بھی ہوتے ہیں اس لیے ان سے اعلیٰ درجہ کی محبت ہونا بالکل فطری بات ہے اور یہی محبت درحقیقت مطلق اطاعت اور بلا چون و چرا اتباع و تسلیم کی مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ بقول اقبال سے

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

انسان جب کسی سے عشق و محبت کرتا ہے تو اس کے اشاروں پر چلنا اور اس کے رنگ میں رنگ جانا اس کی سب سے بڑی خواہش بن جاتی ہے۔ پھر اس راہ کے پتھر بھی اسے پھول معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ محبوب کے اشارہ پر اور اس کو خوش کرنے کے لیے جان دینا بھی اس کے واسطے آسان ہو جاتا ہے ؎

عشق اگر فرماں دہد از جانِ شیریں ہم گزر
عشق محبوب است و مقصود است و جاں مقصود نے

غرض "ایمان بالرسول" کے مقصدِ اصلی (اطاعتِ رسول) کی تکمیل بھی محبتِ رسول ہی سے ہوتی ہے۔ اور یہی منشا ہے اس حدیث کا جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تم میں سے کوئی بھی حقیقی مومن نہیں ہو سکتا، تاوقتیکہ اس کو اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور دوسرے تمام انسانوں سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو جائے۔"

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ
وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ (بخاری، مسلم)

اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہو جائے تو کم از کم اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت اور آپ کے دکھ درد میں آپ شریک ہو جائیں گے، یعنی جن چیزوں سے حضورؐ کو مسرت اور خوشی ہوا کرتی تھی اُن سے آپ کو خوشی ہونے لگے گی اور جن چیزوں سے آپ کو رنج اور صدمہ ہوا کرتا تھا اُن سے آپ کو بھی رنج اور صدمہ پہنچنے لگے گا۔ اور یہ بڑی دولت ہوگی۔ اسی

طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے جذبات اور اوصاف: اخلاق کا پرتو بھی آپ پر پڑنے لگے گا، کیوں کہ یہ محبت کا لازمی ثمرہ ہے۔ اور اس طرح آپ اپنی ذاتی خصوصیات اور عادات کو چھوڑتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کی برکات کو اپنے میں جذب کرتے جائیں گے، اور یہی اُمتی کا کمال ہے ؎

غنچۂ ای از شاخسار مصطفےٰ　　گل شو از بادِ بہار مصطفےٰ!
از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرۂ از خُلق او باید گرفت
از مقام او اگر دور ایستی
از میانِ معشرے ما نیستی

(اقبال)

